ہندوستان کی شرعی حیثیت

از ـــــ سعید احمد اکبرآبادی

(۱)

"ہندوستان اور دارالحرب" کے نام سے دارالاشاعت رحمانی مونگیر (بہار) کی طرف سے اعلیٰ کاغذ پر اور عمدہ کتابت و طباعت کے ساتھ بڑے سائز پر سات صفحے کا ایک رسالہ شائع ہوا ہے[۱] جو حضرت الاستاذ مولانا محمد انور شاہ کشمیری کی ایک تحریر پر مشتمل ہے۔ اس تحریر میں ہندوستان کے متعلق دارالحرب ہونے کا فتویٰ دیا گیا ہے۔ اصل تحریر فارسی میں ہے۔ اس پر اردو میں مولانا سید منت اللہ صاحب مونگیری امیر شریعت بہار نے ڈیڑھ صفحہ کی جو تقریب لکھی ہے اُس میں انھوں نے اس کی روئداد لکھی ہے کہ یہ تحریر خانقاہ رحمانیہ تک کیوں کر پہونچی اور پھر جزم و یقین کے ساتھ لکھا ہے کہ اس تحریر کے مصنف (صرف کاتب یا ناقل نہیں) حضرت شاہ صاحب ہی ہیں اور اس بنا پر یہ فتویٰ شاہ صاحب کا ہی ہے، امیر شریعت بہار نے صرف اس پر اکتفا نہیں کیا بلکہ لگے ہاتوں موجودہ ہندوستان کی نسبت بھی اپنے عندیہ کا اظہار کر دیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں :-

"ظاہر ہے حضرت شاہ صاحب کی یہ تحریر تقریباً چالیس برس پہلے کی ہے جبکہ انگریزوں کا دورِ حکومت تھا' اس تحریر میں دارالحرب کے لئے جو اصل و بنیاد بتلائی گئی ہے اسے سامنے رکھ کر موجودہ ہندوستان کے متعلق بھی آسانی سے فیصلہ کن رائے قائم کی جا سکتی ہے "

---

[۱] یہ رسالہ بہت دن ہوئے شائع ہوا تھا اور اُنھیں دنوں میں برہان میں تبصرہ کے لئے موصول ہوا تھا۔ لیکن میرے قیام کناڈا اور دوسرے سفر اور مصروفیتوں کے باعث کتب برائے تبصرہ کا جو عظیم انبار لگ گیا ہے یہ رسالہ بھی اسی انبار میں دبا پڑا رہا۔ ابھی چند روز ہوئے تبصرہ کی کتابوں کو الٹ پلٹ کرتے ہوئے نظر سے گذرا ہے۔

اس بناء پر اس موضوع پر ہماری گفتگو کے دو جز ہوں گے۔ پہلے جز میں گفتگو زیر بحث تحریر و رسالہ سے متعلق ہوگی اور دوسرے جز میں موجودہ ہندوستان کی شرعی حیثیت سے متعلق۔

شاہ صاحب کی طرف اس تحریر کا انتساب غلط ہے

ہم خود حضرت الاستاذ کے خط سے آشنا ہیں۔ اور آپ کے متعدد خطوط اور تحریریں ہمارے پاس محفوظ بھی تھیں جو ۱۹۴۷ء کے ہنگامہ میں گھر کے سب سامان کے ساتھ لٹ گئیں۔ اس بناء پر اس میں تو کوئی شبہ ہی نہیں کہ یہ تحریر لکھی ہوئی حضرت الاستاذ کے ہاتھ کی ہی ہے لیکن ساتھ ہی اس میں بھی کوئی شک نہیں ہوسکتا کہ حضرت الاستاذ اس کے صرف ناقل ہیں مصنف نہیں، کاتب ہیں، صاحب تحریر نہیں۔ اس بناء پر اس تحریر میں جو کچھ درج ہے اُس کو شاہ صاحب کی رائے یا فتویٰ قرار دینا قطعاً غلط ہے۔ چنانچہ اتنی بات تو مولانا منت اللہ بھی لکھتے ہیں کہ یہ تحریر شاہ صاحب کے مسودات میں ملی ہے اور اس پر شاہ صاحب کے دستخط نہیں ہیں۔

کیا یہ فتویٰ حضرت گنگوہی کا ہے

اصل یہ ہے کہ اب سے کم و بیش پینتالیس برس پہلے یعنی ۱۳۵۲ھ میں مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی ثم کراچوی نے مکتبۂ دار التبلیغ دیوبند ضلع سہارنپور کی طرف سے ایک رسالہ شائع کیا تھا جس کا عربی نام "فیصلة الاعلام فی دار الحرب و دار الاسلام" اور اُردو نام "کیا ہندوستان دار الحرب ہے" تھا، مفتی صاحب اس رسالہ کے تعارف میں لکھتے ہیں:

"ہندوستان کے دار الاسلام و دار الحرب ہونے کا مسئلہ ایک عرصہ سے زیر بحث چلا آتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں آج قطب عالم جنید زمان ابو حنیفۂ وقت حضرت مولانا رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا وہ فتویٰ شائع کیا جاتا ہے جو آپ نے ہندوستان کے دار الحرب ہونے کے متعلق بعض اہل علم تلامذہ کے سوال کے جواب میں مفصل و مکمل تحریر فرمایا ہے اور جس کی نقل حضرت ممدوح کے صاحبزادے حکیم مسعود احمد صاحب رح نے احقر کو عطا فرمائی تھی۔ اور حضرت کے اقارب و تلامذہ میں دوسرے متعدد حضرات کے پاس بھی اس کی نقلیں موجود ہیں"

علاوہ ازیں ہمارے شعبۂ دینیات کے لکچرر قاری محمد رضوان اللہ جن کو حضرت الاستاذ مولانا محمد انور شاہ پر ایک ضخیم تحقیقی مقالہ پیش کرنے پر مسلم یونیورسٹی کی طرف سے اسی سال پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی ہے ——

مفتی محمد شفیع صاحب ان کو ایک خط مورخہ ۱۷ محرم الحرام ۸۳ھ میں تحریر فرماتے ہیں :-

"میں قدیم زمانۂ طالب علمی سے سنتا تھا کہ حضرت گنگوہی کا کوئی فتویٰ اس سلسلہ میں مفصل ہے۔ پھر عرصۂ دراز کے بعد میں گنگوہ گیا تو حضرتِ گنگوہی کے مسودات میں مجھے یہ فتویٰ ملا اور میں نے اسے حکیم مسعود احمد صاحب سے مانگ لیا جو آپ نے عنایت فرما دیا۔ میں نے اُردو ترجمہ کے ساتھ اس کو شائع کر دیا۔"

جناب مفتی صاحب نے اس فتوی کو اس طرح شائع کیا ہے کہ اوپر اصل متن فارسی میں ہے، اس کے نیچے خود مفتی صاحب کا ترجمہ ہے اُردو ترجمہ ہے اور ادھر اُدھر جو حواشی ہیں وہ مولانا محمد سہول صاحب عثمانی نے لکھے ہیں جو اُس زمانہ میں دار العلوم دیوبند کے صدر مفتی تھے۔ اب آپ حضرت شاہ صاحب کی تحریر کو حضرت گنگوہی کی تحریر کے ساتھ ملا کر پڑھئے تو معلوم ہوگا کہ اوّل الذکر موخر الذکر کی حرف بحرف نقل ہے۔ فرق اگر ہے تو صرف اس قدر کہ فتوی کے ناقل چونکہ حضرت شاہ صاحب خود ہیں اس لئے املا اور کتابت کے اغلاط سے یہ تحریر بالکل پاک وصاف ہے اور مفتی صاحب کے شائع کردہ رسالہ میں متعدد غلطیاں تصحیح سے رہ گئی ہیں۔ علاوہ بریں حضرت شاہ صاحب نے اس کو نقل کرتے وقت اصل عبارت میں جو بعض جملے مکرر یا غیر ضروری تھے ان کو حذف کر دیا ہے۔ اس معمولی فرق کے علاوہ دونوں تحریریں من وعن ایک ہیں، اس بنا پر جیسا کہ مفتی صاحب نے لکھا بھی ہے جہاں حضرت گنگوہی کے متعدد اقارب وتلامذہ کے پاس حضرت کے اس فتوی کی نقول بوجود تھیں ایک نقل حضرت شاہ صاحب کے پاس بھی تھی۔ اور اس کو ہی خود حضرت شاہ صاحب کی تحریر سمجھ کر آپ کی طرف منسوب کر کے چھاپ دیا گیا ہے۔

ہندوستان کے متعلق حضرت شاہ صاحب کی رائے

مذکورۂ بالا تفصیلات سے یہ قطعی طور پر ثابت ہو گیا کہ زیرِ تبصرہ فتویٰ حضرت شاہ صاحب کا ہرگز نہیں ہے۔ اب رہی یہ بات کہ خود حضرت شاہ صاحب کا اس بارہ میں خیال کیا تھا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ آپ کے نزدیک ہندوستان دار الحرب نہیں بلکہ دار الامان بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ فقہا کی اصطلاح میں (جس پر بحث آگے آرہی ہے) دار العہد تھا۔ چنانچہ دسمبر ۱۹۲۶ء میں پشاور کی جمعیۃ علمائے ہند کی عظیم الشان سالانہ کانفرنس میں بحیثیت صدر کے آپ نے

جو ایک نہایت معرکۃ آرا خطبۂ صدارت فارسی زبان میں پڑھا تھا اُس میں اس کا ذکر کیا ہے اور ہندوستان کی اُس وقت کی پوزیشن کا مقابلہ اُس وقت سے کیا ہے جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور یہودِ مدینہ کے درمیان معاہدہ ہوا تھا۔ فرماتے ہیں :-

"ملکِ ما اگر ہست دارالامان ست و ما سکونت اندران داریم۔ باید کہ احکامِ این دار از کتبِ مذہب تلاش کنیم۔ استیعاب آن این وقت ممکن نیست البتہ جملۂ چند از معاہدۂ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم با یہودِ مدینہ در ابتدا ہجرت از سیرت ابن ہشام نقل می کنم کہ نمونہ از نوعیت معاہدہ با غیر مسلم در غیر دار اسلام معلوم شود۔"[1]

شاہ صاحب ہندوستان کو دارالعہد مانتے تھے اسی وجہ سے پشاور کے مذکورۂ بالا اجلاس میں حکومتِ ہند سے محکمۂ قضا کے قیام کا مطالبہ کیا گیا اور اس سلسلہ میں جو تجویز منظور ہوئی تھی اُس میں محکمہ سے متعلق یہ الفاظ بھی تھے۔ "جو بحسب معاہدۂ حکومت ہمارا شرعی حق ہے"[2]

حضرت گنگوہی کا ایک اور مطبوعہ فتویٰ اب آیئے اصل تحریر پر گفتگو کریں۔ جیسا کہ مفتی محمد شفیع صاحب نے جزم و یقین کے ساتھ بیان کیا اور لکھا ہے۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ یہ واقعی حضرت گنگوہی کی تحریر ہے تو قطع نظر اس بات کے کہ اس تحریر پر حضرت گنگوہی کے دستخط نہیں ہیں اور یہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے مسودات میں مفتی صاحب کو اسی طرح ملی تھی جس طرح مولانا منت اللہ کو شاہ صاحب کے مسودات میں دستیاب ہوئی تھی۔ ایک بڑا اشکال یہ وارد ہوتا ہے کہ اس تحریر میں حضرت گنگوہی نے پوری قوت و صراحت کے ساتھ ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا ہے۔ لیکن ایک اور فتویٰ جو مطبوعہ ہے اور جس پر آپ کے دستخط اور مہر بھی ہے وہ فتویٰ اوّل کی تردید کرتا ہے۔ چنانچہ ایک شخص نے سوال کیا "ہند دارالحرب ہے یا نہیں"؟ اس کے جواب میں فرمایا:-

"ہند کے دارالحرب ہونے میں اختلاف علما کا ہے۔ بظاہر تحقیقِ حال بندہ کی خوب نہیں ہوئی۔ حسبِ تحقیق اپنی کے سب نے فرمایا ہے اور اصل مسئلہ میں کسی کو خلاف نہیں اور بندہ کو خوب تحقیق نہیں کہ کیا کیفیت ہند کی ہے۔"[3] فقط واللہ تعالیٰ اعلم، رشید احمد عفی عنہ گنگوہی

---

[1] مہاجر دیوبند ج ۲ نمبر ۱ ص ۴۔ [2] مہاجر ج ۱ نمبر ۱

[3] فتاویٰ رشیدیہ مطبوعہ قرآن محل کراچی۔ باب الربوا ص ۴۳۰۔

غور کیجئے کہاں وہ جزم و یقین اور کہاں یہ تردّد و تذبذب۔ اس موخرالذکر فتوی پر جو تاریخ کندہ ہے وہ ۱۳۰۱ ہجری ہے۔ پہلے فتوی پر نہ دستخط ہیں اور نہ تاریخ۔ لیکن قیاس کہتا ہے کہ یہ اگر واقعی حضرت گنگوہی کی تحریر ہے بھی تو فتوئ ثانی پر یقیناً برسوں مقدم ہوگی۔ پھر یہ کیسی عجیب بات ہے کہ ۱۳۰۱ ہجری سے برسوں پہلے تو حضرت کو ہند کی کیفیت کا بخوبی اور واضح طور پر علم تھا اور اس بنا پر آپ نے ملک کو دارالحرب قرار دے دیا۔ لیکن اس واقعہ کے برسوں بعد آپ کو ہند کی کیفیت کی خوب تحقیق نہیں رہی اور اس لئے اب ہند کو نہ دارالاسلام فرماتے ہیں اور نہ دارالحرب۔ کیا کوئی معمولی سمجھ کا آدمی بھی اس ترتیب کو باور کرسکتا ہے!!

ایک تضاد اس کے علاوہ ایک اور اشکال یہ وارد ہوتا ہے کہ مفتی محمد شفیع صاحب کے شائع کردہ رسالہ کے خاتمہ پر مولانا محمد سہول صاحب عثمانی نے حواشی کے علاوہ ایک عبارت بھی لکھی ہے جس میں وہ حضرت گنگوہی کے حوالہ سے ہندوستان کو دارالامان کہتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:-

"یہاں یہ بات ظاہر کردینا بہت ضروری ہے کہ آج کل ہندوستان باستثناء اسلامی ریاستوں کے اگرچہ حضرت مجیب (مولانا گنگوہی) اور حضرت شاہ عبدالعزیز اور بعض دیگر اکابر کی تصریح کے مطابق دارالحرب ہے۔ مگر واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دارالامان ہے .....

یہی وجہ ہے کہ یہاں سے مسلمانوں کو ہجرت ضروری نہیں ہے۔ کاتب الحروف کے استفسار پر حضرت گنگوہی نے ایسا ہی مشافہۃً فرمایا تھا جو بندہ کو خوب اچھی طرح سے یاد ہے"[1]

ان تینوں تحریروں کو سامنے رکھا جائے تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مولانا گنگوہی نے ہندوستان کی نسبت فرمایا:

(الف) ہند دارالحرب ہے۔

(ب) ہند کے متعلق بندہ کو خوب تحقیق نہیں۔

(ج) ہند دارالامان ہے۔

اب "کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟"

---

[1] رسالۂ مذکورہ ص ۱۶۔

تاریخی پس منظر | حقیقت یہ ہے کہ آپ اس معمہ کو اُس وقت تک حل کر ہی نہیں سکتے جب تک ان آرا اور افکار و خیالات کو گذشتہ دو ڈھائی سو برس کی تاریخ کے پس منظر کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش نہ کریں گے۔ واقعہ یہ ہے کہ اورنگ زیب عالمگیر کے بعد سلطنت پر زوال طاری ہوا تو کسی منزل پر پہونچ کر رکا نہیں، بلکہ روز بروز حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ حضرت شاہ ولی اللہ کے زمانہ میں ہی جو عالمگیر کی وفات سے پانچ برس پہلے ۱۱۱۴ھ میں پیدا ہوئے تھے پوری سوسائٹی "تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم" کا مصداق بن گئی تھی۔ چنانچہ شاہی خاندان، اعیان و امرا، علما، صوفیا، تجار، عوام اور خواص غرضکہ کوئی طبقہ ایسا نہیں ہے جس کا ماتم شاہ صاحب نے تفہیمات میں خصوصاً اور دوسری کتابوں میں عموماً بڑے درد و کرب کے ساتھ نہ کیا ہو، اخلاقی زندگی کے حد درجہ فاسد ہونے کے ساتھ بدامنی اور شورشِ عام کا یہ عالم تھا کہ مسلمانوں کی نہ جان محفوظ تھی اور نہ مال، ان کی عبادت گاہیں اور عورتوں کی عصمت و ناموس تک خطرہ میں تھی۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں :-

> "دہلی والوں کے لئے زندگی اجیرن ہوگئی تھی۔ بہت سے مسلمان تھے جو خودکشی کے ذریعہ ان مصائب و آلامِ ناگفتنی سے رستگاری کی سوچنے لگے تھے"[1]

اس وقت خوف و ہراس اور دہشت و سراسیمگی کا کیا عالم تھا ! اس کا اندازہ شاہ ولی اللہ کے اس شعر سے ہوگا !

کأن نجوما او مضت فی الغیاھب ÷ عیون الافاعی او روس العقارب

ترجمہ:- جو ستارے تاریکیوں میں چمکتے ہیں وہ بھی ایسے نظر آتے ہیں کہ گویا وہ سانپوں کی آنکھیں ہیں یا بچھوؤں کے ڈنک۔

ہندوستان جو فقہا کی اصطلاح کے مطابق چھ سو برس سے دار الاسلام بنا چلا آرہا تھا۔ ان حالات نے شاہ صاحب جیسے مفکر کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ وہ اب بھی دار الاسلام ہے یا نہیں؟ اگرچہ ہماری نظر سے کہیں نہیں گذرا کہ شاہ صاحب نے ملک کو دار الحرب کہا ہو لیکن وہ ملک کا جو نقشہ کھینچتے اور اس کے جو حالات بیان کرتے ہیں وہ ہرگز کسی دار الاسلام کے نہیں ہو سکتے اور اس بنا پر یہ بے تکلف کہا جا سکتا ہے کہ اُن کے

---

[1] تاریخ مشائخ چشت ص ۳۳۱۔

نیم شعوری ذہن میں ہندوستان کی نسبت دارالحرب میں منتقل ہوجانے کا تصور موجود تھا۔ چنانچہ انھوں نے پہلے نہایت اثر انگیز اور پُرجوش خطوط کے ذریعہ نجیب الدولہ اور نظام الملک کو فوجی طاقت کے ذریعہ اصلاحِ حال کی دعوت دی اور آخر کار جب اس سے کام نہیں چلا تو احمد شاہ ابدالی کو ایک نہایت مفصل خط لکھا جس میں ملک کی سیاسی حالت کو واضح طور پر بیان کرنے کے بعد مکتوب الیہ سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ مسلمانوں کو مرہٹہ راج گردی سے نجات دے۔[1]

ابدالی طوفان برق و باد کی طرح آیا مگر!

التفاتِ یار تھا اک خواب آغاز وفا ؛ سچ ہوا کرتی ہیں ان خوابوں کی تعبیریں کہیں!

میدانِ پانی پت میں اُس نے مرہٹوں کو شکستِ فاش دی اور جو کچھ ہاتھ لگا اسے لے لوا واپس چلا گیا۔ اس زبردست بھونچال سے عبرت پذیر ہوکر سنبھلنے کے بجائے مریض سلطنت کا حال اور ابتر ہوگیا مرہٹوں کا اب وہ زور تو رہا ہی نہیں تھا اس بنا پر نتیجہ یہ ہوا کہ ایک غیر ملکی اور اجنبی طاقت انگریزوں کی ابھرنی شروع ہوئی۔ یہ نہایت منظم، ترقی یافتہ اور حوصلہ مند طاقت تھی، اُس نے جنوب اور مشرق کی طرف سے بڑھتے بڑھتے پورے ملک میں اس درجہ اثر و نفوذ قائم کر لیا کہ ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک کی فوجیں دہلی میں داخل ہوگئیں۔ اور اکبر و جہانگیر کے تخت و تاج کا وارث شاہِ عالم انگریزوں کا وظیفہ خوار قیدی بن کر رہ گیا۔

شاہ عبدالعزیز کا فتویٰ | یہ بالکل ایک نئی صورتِ حال تھی جو اسلامی ہند کی تاریخ میں پہلی مرتبہ پیش آئی تھی اس بنا پر شاہ عبدالعزیز (از ۱۱۵۹ھ تا ۱۲۳۹ھ) جو ایک جماعت کے ساتھ اپنے والد حضرت شاہ ولی اللہ کی فکری امانت کے حامل اور ترجمان تھے۔ انھوں نے صاف لفظوں میں ہندوستان کے دارالحرب ہونے کا فتویٰ صادر کر دیا۔ چنانچہ بعض کتبِ فقہ سے کچھ عبارتیں نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں :-

"اس شہر (دہلی) میں مسلمانوں کے امام کا حکم بالکل جاری نہیں ہے، بلکہ نصاریٰ کے سرداروں اور افسروں کا حکم بے دغدغہ جاری ہے ..... ہاں اگر بعض اسلامی احکام مثلاً جمعہ اور عیدین اور اذان اور گاؤکشی وغیرہ سے یہ لوگ تعرض نہیں کرتے ہیں تو پڑے نہ کریں مگر

---

[1] شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات : مرتبۂ پروفیسر خلیق احمد نظامی ص از ۴۵ تا ۵۳۔

ان احکام کی اصل الاصول اُن کے نزدیک بالکل صحیح اور صائب ہیں۔ کیوں کہ مسجدوں کو جو خانۂ خدا ہیں بے تکلف مسمار اور خراب کرا دیتے ہیں۔ اگر کوئی مسلم یا ذمی (غیر مسلم) انگریزوں سے پناہ لئے بغیر دلّی یا اُس کے گرد و نواح میں داخل ہو، چاہے تو ممکن نہیں ہے۔ یہاں تک کہ شجاع الملک اور ولایتی بیگم بھی ان لوگوں کی اجازت کے بغیر اس شہر میں نہیں آسکتے..... غرضکہ جب حدیثوں اور صحابۂ کرام اور خلفائے عظام کی سیرت پر تجسس نگاہیں ڈالی جاتی ہیں تو سمجھ میں یہی آتا ہے کہ یہ شہر دارالحرب کا حکم رکھتا ہے"[1]

علاوہ ازیں ایک شخص نے دارالحرب میں سودی لین دین کے بارہ میں سوال کیا ہے تو حضرت شاہ صاحب نے اس کے جواب میں بھی دارالحرب اور دارالاسلام کی بحث چھیڑی ہے اور اس سلسلہ میں مختلف اقوال و آرا نقل کرنے اور اپنی رائے بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں:-

"اور جب یہ ہے تو انگریزوں اور ان جیسے کافروں کے مقبوضات بلاشبہ دارالحرب ہیں"[2]

دیگر علما کے فتاویٰ شاہ عبدالعزیز صاحب اس فتوے میں منفرد نہیں تھے۔ بلکہ دوسرے علما کا فتویٰ بھی یہی تھا۔ چنانچہ ڈاکٹر ہنٹر لکھتا ہے:-

"جوں جوں ہماری (انگریزوں کی) طاقت مضبوط ہوتی گئی علما کے فتووں میں ہندوستان کا دارالحرب ہونا زیادہ نمایاں ہوتا گیا۔ مولوی عبدالحی صاحب جو مولانا شاہ عبدالعزیز کے بعد ہوئے صاف طور پر حکم لگاتے ہیں کہ "عیسائیوں کی پوری سلطنت کلکتہ سے لے کر دہلی اور ہندوستان خاص سے ملحقہ ممالک (یعنی شمالی مغربی سرحدی صوبے تک) سب کی سب دارالحرب ہے کیونکہ کفر اور شرک ہر جگہ رواج پا چکا ہے اور ہمارے شرعی قوانین کی کوئی پروا نہیں کی جاتی۔ جس ملک میں ایسے حالات پیدا ہو جائیں وہ دارالحرب ہے"[3]

---

[1] فتاویٰ عزیزی مطبوعہ مجتبائی پریس ص ۱۶ و ۱۷۔ یہ بات بھی لحاظ کے قابل ہے کہ فتوی میں شاہ صاحب نے "دہلی سے کلکتہ تک" انگریزوں کا عمل دخل بتایا اور اس لئے اس علاقہ کو دارالحرب کہا ہے، لیکن ملفوظات میں فرماتے ہیں "کلکتہ سے لاہور تک کا علاقہ دارالحرب ہے" ص ۱۲۳۔ اُردو ترجمہ شائع کردہ پاکستان ریجنل پبلشرز

[2] فتاویٰ عزیزی ص ۱۸۵ [3] بحوالہ نقشِ حیات جلد دوم از مولانا حسین احمد مدنی "حاشیہ ص ۴

سید احمد شہید بریلوی کی تحریک ہندوستان کے انگریزی مقبوضات جن میں دلّی بھی شامل تھی۔ اُن کے متعلق علمائے اعلام کی طرف سے دارالحرب ہونے کا اعلان ہو جانے کے بعد اب مسلمانوں کے لئے صرف دو راہیں ہی ہو سکتی تھیں، ایک یہ کہ اگر اُن میں ہمت ہے تو جہاد کریں اور دوسرے یہ کہ اگر جہاد نہیں کر سکتے تو ہجرت کر جائیں۔ دوسری شکل اختیار کرنا حد درجہ کی بزدلی اور نامردی کی بات ہوتی اس لئے پہلی صورت اختیار کی گئی۔ چنانچہ مدرسۂ شاہ ولی اللہی کے تربیت یافتہ خصوصی سید احمد شہید بریلوی ۱۷ مئی ۱۸۲۶ء کو اپنے پانسو چھ سو معتقدین و مریدین کے ساتھ وطنِ مالوف سے روانہ ہوئے۔ مہینوں کے سخت و شوار اور کٹھن سفر کے بعد ایک جمعیتِ کثیر مہیا کی اور سرحد پہونچ کر ۱۸۲۷ء کے ابتداء میں جہاد کا اعلان کر دیا۔ یہ اعلان اگرچہ پنجاب کی سکھ حکومت کے خلاف تھا جہاں اسلامی شعائر کے علانیہ اظہار و بجا آوری تک پر پابندیاں تھیں لیکن سید صاحب نے کل ہند پیمانہ پر جو تیاریاں کی تھیں وہ صاف طور پر اس بات کی علامت ہیں کہ آپ کا اصل مقصد ہندوستان سے انگریزی اقتدار کو ختم کرنا اور اسے صحیح معنیٰ میں دارالاسلام بنانا تھا۔ چنانچہ آپ نے سرحد سے ریاست گوالیار کے مدارالمہام راجہ ہندو راؤ کو جو مکتوبِ گرامی لکھا ہے اُس میں فرماتے ہیں :-

"جناب پر یہ بات روشن اور ظاہر ہے کہ اجنبی لوگ سمندر پار سے یہاں آکر بادشاہِ زمین و زمان ہو گئے ہیں اور جو سوداگر تھے وہ سلطنت کے مرتبہ کو پہونچ گئے ہیں، ان لوگوں نے بڑی بڑی امارتیں اور ریاستیں برباد کر دی ہیں اور ان کی عزت و آبرو کو خاک میں ملا دیا ہے (ان حالات کے باوجود) چونکہ اربابِ ریاست و سیاست گوشۂ گمنامی و بے عملی میں پڑے ہوئے ہیں اس لئے ہم چند فقیر و اہلِ مسکنت محض دین رب العٰلمین کی خدمت کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں"

علاوہ ازیں مذکورۂ بالا ریاست کے ایک مسلمان عہدہ دار غلام حیدر خان کو جو خط لکھا ہے اُس میں بھی اسی مضمون کا اعادہ کیا ہے فرماتے ہیں :-

"آپ سردار والا مراتب راجہ ہندو رائے کو یہ امر ذہن نشین کرا دیں کہ ہندوستان کے

اکثر شہر غیر ملکی لوگوں (انگریز) کے قبضہ میں جا چکے ہیں اور یہ ہر جگہ ظلم و زیادتی کر رہے ہیں ہندوستانی ریاستوں کو انھوں نے برباد کر دیا ہے اور کوئی شخص ان کے مقابلہ کی تاب نہیں لا سکتا۔ بلکہ ہر ایک ان کو اپنا آقا سمجھنے لگا ہے۔ ان حالات میں چونکہ بڑے بڑے ارباب ریاست ان کے ساتھ نبرد آزمائی سے عاجز ہیں اس لئے ہم چند ضعیف و کمزور انسان کمرِ ہمت باندھ کر اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ [1]

قدرت اپنی حکمتیں خود ہی جانتی ہے۔ یہ جہاد ناکام رہا اور سید صاحب گھر سے ایسے رخصت ہوئے تھے کہ پھر واپس نہ آئے۔ ایک رہروِ راہِ طلب و جستجو کی غیرت و خودداری کی انتہا ہے!

ہاں اہلِ طلب کون سنے طعنۂ نایافت ؎ دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے

(غالب)

سید صاحب اپنے ہزاروں فداکاروں کے ساتھ جامِ شہادت نوش کر کے واصل بحق ہو گئے لیکن جو آگ ہزاروں دلوں میں روشن کر چکے تھے وہ دشمن کے آبِ شمشیر سے کہاں بجھ سکتی تھی اُن کے بعد تحریکِ مجاہدین کا ایک مکمل اور مربوط سلسلہ صادق پور سے درۂ خیبر تک قائم ہو گیا۔ اور اب ان کا براہِ راست مقصد انگریزوں کو ملک باہر کر کے اُس کی قدیم حیثیت کو بحال کرنا تھا۔ ادھر یہ مجاہدین اپنی جدوجہد میں مصروف تھے اور ادھر دلی اور لکھنؤ میں تیزی سے وہ حالات پیدا ہو رہے تھے جن کے بطن سے ۱۸۵۷ کی جنگِ آزادی کا ظہور ہوا۔

جہاد کا براہِ راست فتوی آخر انگریزوں کی روز افزوں زیادتیوں اور آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کی بیچارگی و بے بسی کے باعث جب پانی سر سے اونچا ہو گیا تو دلی کے اخبار "الظفر" میں کھلم کھلا یہ استفتا چھپا۔

"کیا فرماتے ہیں علمائے دین اس امر میں کہ اب جو انگریز دلی پر چڑھ آئے اور اہلِ اسلام کی جان و مال کا ارادہ رکھتے ہیں اس صورت میں اب اس شہر والوں پر جہاد فرض ہے یا نہیں؟ اور اگر فرض ہے تو وہ فرضِ عین ہے یا نہیں؟ ....

[1] مجموعۂ خطوط قلمی بحوالہ "مسلمانوں کے تنزل سے دنیا کو کیا نقصان پہونچا" از مولانا ابوالحسن علی ندوی ص ۲۴۵-۲۴۶

اس استفتا کا جواب مرتب کرنے کے لئے جامع مسجد دلّی میں علمائے کرام کا ایک اہم اجتماع ہوا اور فتویٰ ذیل مرتب کرکے شائع کیا گیا:-

"الجواب: درصورتِ مرقومہ فرضِ عین ہے اور پر تمام اس شہر کے لوگوں کے اور استطاعت ضرور ہے اُس کی فرضیت کے واسطے۔ چنانچہ اس شہر والوں کو طاقتِ مقابلہ اور لڑائی کی ہے بسبب کثرتِ اجتماع افواج کی اور موجود مہیا ہونے آلاتِ حرب کے تو فرضِ عین ہونے میں کیا شک رہا الخ"[1]

مولانا فضل حق کا فتویٰ اس وقت ہمارے سامنے فتویٰ کی جو نقل موجود ہے اُس پر ۳۸ دلّی کے علما و مشائخ کے دستخط ہیں۔ مولانا فضل حق خیرآبادی کے اس پر دستخط نہیں ہیں، لیکن اُن کا ایک الگ مستقل فتوائے جہاد تھا جس کا ذکر ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی اسلامی تاریخوں میں تفصیل کے ساتھ کیا گیا ہے، مولانا بلند پایہ عالمِ دین ہونے کے ساتھ رئیسانہ طور طریق زندگی رکھتے تھے، لیکن اس کے باوجود ان کی ایمانی جرأت و حسارت اور دینی حمیت و غیرت کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے ہر چیز سے بے نیاز ہو کر دلّی کی جامع مسجد میں نمازِ جمعہ کے بعد جہاد کے واجب ہونے پر ایک نہایت ولولہ انگیز تقریر کی اور اُس کے بعد جہاد کے ایک اور فتویٰ کا اعلان ہوا جس پر صدر الصدور مفتی صدر الدین خان آزردہ، مولانا فیض احمد بدایونی۔ ڈاکٹر مولوی وزیر خان اکبرآبادی اور دوسرے علما کے دستخط تھے۔ اس فتویٰ کے شائع ہوتے ہی ملک میں آگ لگ گئی اور خاص دہلی میں نوّے ہزار سپاہ جمع ہوگئی:[2] اِدھر یہ ہوا اور دوسری طرف اکابرِ دیوبند جو سلسلۂ ولی اللّٰہی کے بقیۃ السلف تھے یعنی حضرت حاجی امداد اللہ۔ مولانا گنگوہی اور مولانا نانوتوی وغیرہم انھوں نے باقاعدہ جہاد کا فتویٰ دیا اور جب جنگ چھڑی تو اُس میں عملاً حصّہ لے کر دادِ شجاعت دی۔

مسلمانوں کے لئے یہ جہاد تھا۔ لیکن استخلاصِ وطن کی غرض سے غیر مسلم بھی اُن کے ساتھ برابر کے شریک تھے اور اس بنا پر اس کا اہتمام و انتظام بہت بڑے پیمانہ پر کیا گیا تھا۔ لیکن بایں ہمہ یہ کوشش بھی ناکام رہی اور نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان ایسٹ انڈیا کمپنی کے بجائے باضابطہ طور پر تاجِ برطانیہ کے مقبوضات و مستعمرات

---

[1] جنگِ آزادی از خورشید مصطفےٰ صاحب رضوی ص ۵۶۸ [2] الثورۃ الہندیہ ص ۱۵۶۔

میں شامل ہوگیا۔ اس جنگ میں ناکامی کے باوجود مجاہدین نے ہار نہیں مانی اور ان کی سرگرمیاں ایک خاص دائرۂ عمل میں برابر جاری رہیں اور ۱۸۶۳ء و ۱۸۶۸ء میں انگریزوں اور مجاہدین میں سخت معرکہ ہوا۔

اگرچہ ۱۸۵۸ء میں ملکہ وکٹوریہ کی طرف سے اعلان ہوچکا تھا کہ اب کسی سے کوئی انتقام نہیں لیا جائے گا ہر شخص کو مذہبی آزادی ہوگی اور حصولِ معاش کے دروازے کسی پر بند نہیں ہوں گے لیکن شروع شروع میں اس اعلان پر خاطر خواہ عمل نہیں ہوا اور مجاہدین کی سرگرمیاں بھی برابر جاری رہیں۔ لیکن انگریزوں کی حکومت میں جتنا استحکام پیدا ہوتا رہا۔ ملک میں امن و امان اور انفرادی و جماعتی آزادی کی فضا پیدا ہوتی رہی۔ اب مذہب آزاد تھا۔ دینی تعلیم و تبلیغ پر کوئی پابندی نہیں تھی، قانون مسلمانوں کے جان و مال کی حفاظت کی ضمانت کرتا تھا اور اس پر عمل بھی ہو رہا تھا۔ حصولِ معاش کے دروازے ہر ایک پر کھلے ہوئے تھے اور مسلمانوں کو سرکاری دفتروں اور محکموں میں جگہیں مل رہی تھیں۔ غرضکہ اب انگریز کے ساتھ جنگ کا دور ختم ہوچکا تھا۔ ملک میں ایک آئینی حکومت قائم تھی۔ اگرچہ بدیشی تھی اور یہ صورت پہلی صورتِ حال سے بالکل مختلف تھی۔ پہلے جنگ تھی۔ اب صلح تھی۔ پہلے حرب و ضرب کا دور تھا اب امن و امان کا عہد تھا اور اب مسلمانوں کے لئے موقع تھا کہ وہ تعلیمی اقتصادی اور مذہبی بنیادوں پر تنظیم کرکے اپنے لئے نشاۃِ ثانیہ کا سروسامان کریں۔

مولانا گنگوہی کے مختلف اقوال کے وجوہ سطورِ بالا میں ہم نے حضرت شاہ ولی اللہ کے زمانہ سے لے کر انیسویں صدی کے ربعِ آخر تک کے حالات کا جو نہایت ہی مختصر اور سرسری جائزہ لیا ہے اُس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ اس پوری مدت میں ملک کے حالات یکساں نہیں رہے بلکہ ادلتے بدلتے رہے ہیں اور جو جو تغیر ہوتا رہا ہے بحیثیتِ مجموعی علما کا اس ملک کے متعلق شرعی نقطۂ نظر بھی بدلتا رہا ہے۔ اس بنا پر مولانا گنگوہی سے اگر اس سلسلہ میں تین قول ثابت ہیں تو یہ حیرت کی بات نہیں بلکہ یہ حالات کے تغیر کا اثر ہے۔ چنانچہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ مولانا کا پہلا فتویٰ بزبانِ فارسی و شائع کردۂ مفتی محمد شفیع صاحب یا تو ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی سے پہلے کا ہے یا اُس کے فوراً بعد کا جبکہ پکڑ دھکڑ بڑے پیمانہ پر جاری تھی اور ادھر مجاہدین بھی سرگرمِ عمل تھے۔ اس کے بعد جب حالات ذرا بہتر ہوئے۔ مگر مطلع بالکل صاف نہیں ہوا تھا تو مولانا کو اب پہلی رائے پر اصرار تو نہیں رہا۔ لیکن ساتھ ہی کھل کر دارالحرب ہونے کی نفی بھی نہیں کرسکے۔ اور جیسا کہ فتاویٰ رشیدیہ میں ہے کسی

قطعی بات کے کہنے سے معذرت فرمادی۔ پھر جب حالات اور زیادہ بہتر ہوئے امن وامان مکمل طور پر بحال ہوگیا اور مذہبی فرائض ومعمولات بلاخوف وخطر ادا ہونے لگے تو اب حضرت گنگوہی نے اس کو دارالامان قرار دیا۔

حضرت نانوتوی کا ارشاد | مولانا گنگوہی نے تو ترقی کرکے ہندوستان کو دارالامان ہی کہا ہے لیکن مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی نے "ہندوستان میں سودی لین دین" پر بہ صورتِ مکتوب جو ایک نہایت پُرمغز اور مبسوط رسالہ لکھا ہے اُس میں متعدد روایات نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

باعتبارِ روایاتِ منقولہ ہندوستان دارالاسلام ہست — ان روایات کے پیشِ نظر ہندوستان دارالاسلام ہے

اگرچہ اس معاملہ میں مولانا کو پورا اطمینان نہیں ہے۔ چنانچہ آخر رسالہ میں فرماتے ہیں:

دارالحرب بودن ہندوستان کلام چنانچہ از مطالعۂ روایاتِ منقولہ دریافتہ باشی۔ اگرچہ راجح نزد ہیچدان ہمین باشد کہ ہندوستان دارالحرب است۔[1] — ہندوستان کے دارالحرب ہونے میں کلام ہے جیسا کہ گذشتہ روایاتِ منقولہ سے تم کو معلوم ہوا ہوگا اگرچہ اس ہیچدان کے نزدیک راجح یہی ہے کہ ہندوستان دارالحرب ہے۔

لیکن چونکہ رسالہ کا اصل موضوعِ بحث دارالحرب میں "سودی لین دین" ہے اس بنا پر مولانا نے اس پر بڑی سیر حاصل بحث کے ضمن میں ایک بڑی دلچسپ بات یہ ارشاد فرمائی ہے کہ "اوّل تو ہندوستان دارالحرب نہیں دارالاسلام ہے۔ لیکن اگر دارالحرب ہے بھی تو مسلمان کے لئے حسب روایاتِ فقہیہ یہ کہاں جائز ہے کہ وہ دارالحرب میں قیام کرکے سود کھاتا رہے۔ بلکہ حکم یہ ہے کہ سود دارالحرب میں لے اور اسے برتے دارالاسلام میں جو لوگ ہندوستان کو دارالحرب قرار دے کر اُس میں سودی لین دین کو جائز قرار دیتے ہیں۔ مولانا نانوتوی اُن پر ایک نہایت لطیف قسم کا طنز کرتے ہوئے فرماتے ہیں:-

"یہ بڑے عجیب وغریب قسم کے لوگ ہیں، جب ہم کہتے ہیں کہ اچھا! اگر ہندوستان دارالحرب ہے تو تمھیں ہجرت کرنی چاہئے۔ اس پر وہ کہتے ہیں کہ یہ دارالاسلام ہے۔ مگر جب ہم کہتے ہیں کہ یہاں سودی کاروبار جائز نہیں تو جھٹ بول اُٹھتے ہیں کہ یہ تو دارالحرب ہے، گویا چت بھی ان کی اور پٹ بھی ان کی، ہجرت سے بچنے کے لئے اس ملک کو دارالاسلام کہہ دیا اور سود

[1] قاسم العلوم جلد اول مشتمل بر مکتوب ہفتم وہشتم۔ مطبع مجتبائی دہلی ص ۲۸ و ۳۵۔

کمانے کے لئے اسے دارالحرب قرار دے دیا۔ سبحان اللہ ![1]

مولانا عبدالحی لکھنوی کا فتویٰ

مولانا گنگوہی اور مولانا نانوتوی اُن علما میں سے تھے جنھوں نے انگریز کے خلاف جہاد کا فتویٰ دیا۔ میدانِ جنگ میں اُس سے مقابلہ کیا۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے دوران میں اور اس کے بعد مسلمانوں کی خصوصاً اور عام اہلِ ملک کی عموماً عظیم تباہی و بربادی۔ خستہ حالی و پامالی بچشمِ خود دیکھی تھی۔ اس بنا پر حالات خواہ کیسے ہی پُرامن ہوں بہرحال انگریز کے خلاف دلوں میں جو کدورت اور عہدِ گذشتہ کی جو تلخ یاد تھی اُس کی وجہ سے یہ حضرات ہندوستان کی شرعی حیثیت کے متعلق کوئی بات کہتے بھی ہیں تو رک رک کر اور کسی درجہ میں رکھ رکھاؤ کے ساتھ۔ لیکن مولانا ابوالحسنات محمد عبدالحی فرنگی محلی جن کی پیدائش ہی ۱۸۵۷ء کے بعد کی ہے اُن کے لئے اس قسم کا کوئی حجاب ذہنی نہیں تھا۔ اس لئے انھوں نے بالکل صاف و صریح لفظوں میں ہندوستان سے دارالحرب ہونے کی نفی کی اور اُس کے دارالاسلام ہونے کا اثبات کیا ہے۔

سوال یہ تھا کہ "جہاں تک عملداری انگریزوں کی ہے۔ ہندوستان دارالحرب ہے یا نہیں؟ اور اگر ہے تو صرف صاحبین کے مذہب کے مطابق یا ابوحنیفہ کے مذہب کے موافق بھی" مولانا جواب میں فرماتے ہیں:-

"ہندوستان دارالحرب نہیں ہے بلکہ دارالاسلام ہے۔" اس کے بعد مولانا نے اپنے اِس دعوے کے ثبوت میں کتبِ فقہیہ سے طویل عبارتیں نقل کیں اور ان کا اُردو ترجمہ کیا ہے۔ آخر میں لکھتے ہیں:-

"ان عبارات سے اور ان کے امثال سے واضح ہے کہ دارالاسلام کے دارالحرب ہونے میں یہ شرط ہے کہ احکامِ کفر علانیہ جاری ہوں اور احکامِ اسلام بالکلیہ موقوف کر دیئے جائیں' اور شعائرِ اسلام اور ضروریاتِ دین میں کفار مداخلت کرنے لگیں اور یہ شرط اتفاقی (متفق علیہ) ہے اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے اس کے سوا اور بھی دو شرطیں زائد کی ہیں۔ ایک یہ کہ اس بلدہ میں اور دارالحرب میں کوئی بلدہ مملکتِ اہلِ اسلام کا باقی نہ رہے۔ دوسرے یہ کہ امانِ اوّل اُٹھ جائے اور بامانِ کفار اقامت کی نوبت آئی ہو اور ظاہر ہے کہ بلادِ ہندوستان میں

[1] قاسم العلوم جلد اوّل مشتمل بر مکتوب ہفتم و ہشتم۔ مطبع مجتبائی دہلی ص ۲۹۔

یہ مفقود ہے۔ اس لئے کہ شعائرِ اسلام میں ہنوز حکام کی طرف سے مداخلت اور ممانعت نہیں ہے۔ اگرچہ اکثر قضاۃ کفار ہیں اور خلافِ اسلام احکام جاری کرتے ہیں، مگر بہت سے امور میں مذہبِ اسلام اور شرع کے موافق بھی فیصلہ کرتے ہیں۔ پس ہندوستان امام ابوحنیفہ اور صاحبین رحمہم اللہ کسی کے نزدیک دارالحرب نہیں ہے۔[1]

ایک اور فتویٰ | اسی نوع کا ایک اور فتویٰ کلکتہ میں نواب عبداللطیف صاحب نے جب انھوں نے بنگال میں مسلمانوں کی تعلیمی تحریک شروع کی تھی۔ بعض علما سے حاصل کر کے شائع کیا تھا۔ ان علما میں تحریکِ مجاہدین کے ممتاز عالم مولانا کرامت علی صاحب بھی شامل تھے اور فتویٰ میں کہا گیا تھا کہ "انگریزوں کے ماتحت ہندوستان دارالحرب نہیں ہے"۔[2]

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ مسلمان " لذت کشی دردتہِ جام " کی زندگی بسر کر رہے تھے اس وقت مسلمانوں میں کوئی سیاسی تحریک نہیں تھی اور اگر تھی بھی تو خفیہ یعنی انڈر گراؤنڈ۔ اور اُن کی تمام تر توجہات دیوبند اور علی گڑھ تحریک کے زیرِ اثر جیب و دامانِ تارتار پر بخیہ گری کے لئے وقف تھیں۔ کانگریس اور لیگ دونوں اگرچہ وجود میں آچکی تھیں۔ لیکن اول الذکر کا مقصد انگریزوں کے ماتحت چند داخلی اور انتظامی اصلاحات اور موخرالذکر کا مقصد مسلمانوں کے سیاسی حقوق کی حفاظت کے سوا کچھ اور نہ تھا اس بنا پر ہندوستان پر جب دارالحرب کی تعریف صادق نہیں آتی تھی تو مولانا عبدالحی کو لامحالہ اسے دارالاسلام ہی کہنا تھا۔[3]

تحریکِ ہجرت | لیکن جن علما کے سینوں میں سید احمد شہید کی لگائی ہوئی آگ کے شعلے ابھی تک خاکستر نہیں

---

[1] ترجمۂ اُردو مجموعۃ الفتاویٰ مولانا محمد عبدالحیؒ مطبوعہ قیومی پریس کانپور جلد اول ص از ۱۲۳ تا ۱۲۶۔

[2] ہندوستانی مسلمان (انگریزی) رام گوپال صاحب ص ۵ و ۶۔

[3] ہمیں اُن حضرات اور مشائخ کا بھی علم ہے جنھوں نے سفید فام فرمانروایانِ ہند کو ناصر الملۃ والدین اور حامیِ شریعت مصطفوی کہا ہے اور ترکوں کے مقابلہ میں بھیجے ہوئے ہندوستانی مسلمان فوجیوں کے بازو پر تعویذ باندھے ہیں لیکن ان حضرات کو عوام میں کوئی سندِ اعتماد و اعتبار حاصل نہیں ہے۔ اس لئے ان کا ذکر غیر ضروری ہے۔

ہوئے تھے وہ کب پیچھے بیٹھنے والے تھے انھوں نے ایک فتوی کے ذریعہ ترکِ وطن کی تحریک شروع کردی مولانا غلام رسول مہر جو ہندو پاک کی جدید اسلامی تاریخ کے مبصر عالم ہیں بیان کرتے ہیں:-

"تحریکِ خلافت کی تنظیم سے پیشتر علما کے فتویٰ سے یہاں ہجرت کی تحریک جاری ہوئی۔ میرے نزدیک اس کا مقصد یہ تھا کہ انگریزی حکومت پر دباؤ ڈالا جائے اور دنیا بھر میں اسے بدنام کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ جب دوسرے ملکوں میں یہ اطلاع پہونچتی کہ لاکھوں مسلمان ترکِ وطن پر مجبور ہوئے ہیں تو انگریزوں کے لئے نیک نامی کا کوئی موقع باقی نہ رہتا۔ یہ وقتی تحریک تھی"[1]

دوسری تحریکیں | انھیں دنوں میں یعنی انیسویں صدی کے اواخر میں کانگریس میں مسلمانوں کی شرکت و شمولیت کا مسئلہ اٹھا اور مولانا گنگوہی، مولانا محمود حسن اور دیوبند کے بہت سے علما نے کانگریس میں شرکت کے جواز اور سرسید کی قائم کی ہوئی جماعت "جماعتِ محبانِ وطن" نے شرکت کی ممانعت کا فتویٰ شائع کیا۔[2] پھر حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن کی قیادت میں تحریک انقلاب یا بالفاظِ دگر "ریشمی خطوط کی تحریک" شروع ہوئی۔ اس کے بعد خلافت اور پھر ترکِ موالات کی تحریکوں کا دور آیا۔

اب غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اس پورے دور میں جبکہ انگریزوں کے خلاف یہ تحریکیں چل رہی تھیں۔ ہندوستان کی نسبت ان علما کا جو تحریکوں سے وابستہ تھے شرعی طور پر کیا نقطۂ نظر رہا ہے؟ یہ صحیح ہے کہ ان تمام تحریکوں کا مقصد ہندوستان سے انگریزوں کا اخراج اور ملک کی آزادی تھا۔ لیکن اگر یہ تمام کوششیں آئین اور قانون کے اندر رہ کر کی گئی ہیں تو ظاہر ہے اس صورت میں ملک کی شرعی حیثیت کچھ اور ہوتی ہے اور اگر ان تحریکوں میں حرب وضرب۔ تشدد اور قانون شکنی وغیرہ ان سب چیزوں کو تحریکوں کے بانی اور ہمدرد علما کی تائید و رضامندی کی سند حاصل تھی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اُن کی نظر میں ہندوستان کی حیثیت پہلی حیثیت سے مختلف تھی۔

---

[1] ملاقاتیں: مرتبۂ الطاف حسن صاحب قریشی ص ۱۸۶

[2] نقشِ حیات: از مولانا حسین احمد صاحب مدنی جلد دوم ص ۷۱۔

دارالعہد اس سلسلہ میں ہم صرف دو تحریریں پیش کر سکتے ہیں۔ ایک مولانا محمد انور شاہ الکشمیری کی اور دوسری مولانا سید حسین احمد مدنی کی! حضرت شاہ صاحب کے متعلق اجمالاً گذر چکا ہے کہ آپ نے پشاور کے خطبۂ صدارت میں ہندوستان کو دارالامان کہا ہے۔ لیکن جیسا کہ ہم نے اُسی موقع پر اشارہ کیا تھا۔ درحقیقت شاہ صاحب کی مراد دارالامان سے دارالعہد ہے۔ چنانچہ خطبۂ متعلقہ میں آپ نے حکومت اور مسلمانوں کے تعلقات کی شرعی نوعیت کے متعلق جو کچھ فرمایا ہے اس سے اس کی تائید کی ہوئی ہے۔ علاوہ ازیں مولانا بدرِ عالم مرحوم حضرت شاہ صاحب سے نقل کرتے ہیں:-

"ہمیں معلوم ہوا ہے کہ شاہ اسحاق صاحب محدث دہلوی ہندوستانیوں کو انگریز کے ہاتھوں میں قیدی سمجھتے تھے اور کسی معاہدہ کے قائل نہیں تھے۔ لیکن میرے نزدیک محقق بات یہ ہے کہ اگرچہ حکومت اور اہلِ ہند کے درمیان باقاعدہ کوئی معاہدہ نہیں ہے لیکن عملاً معاہدہ ہے۔ چنانچہ ہم اپنے معاملات ان کی عدالتوں میں لے جاتے ہیں۔ اور جانی و مالی امور میں اُن سے مدد طلب کرتے ہیں اور اُن تمام معاملات میں ہم ان کی طرف رجوع کرتے ہیں جن میں فریقینِ معاہدہ ایک دوسرے کی طرف رجوع کیا کرتے ہیں۔ اگرچہ اس بات کو کسی فقیہ نے نہیں لکھا ہے۔ مگر میرے نزدیک حکم یہی ہے اور اس پر ہی تمام تفریعات ہوں گی"[1]

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب معاہدہ ہے تو پھر قومی تحریکوں میں توڑ پھوڑ مار پیٹ اور سول نافرمانی وغیرہ قسم کی جو چیزیں ہوتی ہیں اُن کے جواز کی کیا صورت ہوگی؟ کیونکہ یہ سب نقضِ عہد میں داخل ہیں اور اسلام میں نقضِ عہد سخت گناہ ہے، غالباً یہی سوال حضرت شاہ صاحب کے ذہن میں تھا۔ چنانچہ عبارت مذکورۂ بالا کے فوراً بعد جواباً فرماتے ہیں:-

"یہ معاہدہ پہلے جان اور مال دونوں کے متعلق تھا۔ لیکن اب جان سے متعلق معاہدہ کو ہم نے اُن کے مُنہ پر دے مارا ہے (یعنی وہ ہماری جان کے ذمہ دار نہیں اور ہم اُن کی جان کے نہیں) البتہ اموال کے بارہ میں معاہدہ اب تک باقی ہے۔ چنانچہ انگریزوں کا مال چرانا جائز نہیں ہے۔

---

[1] فیض الباری علی صحیح البخاری جلد ۳ ص ۴۴۹۔

البتہ ہاں اگر ہم اس معاہدہ کو بھی توڑ دیں تو پھر مال کا چرانا بھی جائز ہوگا۔ لیکن ایسا اسی وقت ہونا چاہیے جب کہ خود حکومت اپنا عہد توڑ دے۔ تاکہ جواب ترکی بترکی ہو۔ غدر اور بے ایمانی نہ ہو [1]

مولانا حسین احمد مدنی کا فتوی | لیکن مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی بالکل اس کے برعکس ہندوستان کو دار الحرب اور ہندو اور مسلمان دونوں کو اس ملک میں انگریزوں کے ہاتھوں قیدی قرار دیتے ہیں۔ اور چونکہ مولانا کے نزدیک یہ ملک دار الحرب ہے اس لئے عہد توں کے سوا دشمنوں یعنی انگریزوں کی ہر چیز مسلمانوں کے لئے مباح ہے [2] ایک اور موقع پر ارشاد فرماتے ہیں :۔

"ہندوستان دار الحرب ہے۔ وہ اس وقت تک دار الحرب باقی رہے گا جب تک اس میں کفر کو غلبہ حاصل رہے گا۔ دار الحرب کی جس قدر تعریفات کی گئی ہیں اور جو شروط بیان کی گئی ہیں وہ سب اس میں موجود ہیں [3]"

اس سلسلہ میں یہ بڑی دلچسپ بات ہے کہ مولانا حضرت شاہ عبد العزیز۔ مولانا فضل حق خیر آبادی اور مولانا گنگوہی کے فتاوی کا حوالہ دے کر فرماتے ہیں۔

"ان پر (یعنی ان حضرات نے جو کچھ فرمایا ہے اس پر) کوئی اضافہ نہیں کیا جا سکتا [4]"

اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ مولانا کے نزدیک ۱۸۰۳ء۔ اور پھر ۱۸۵۷ء کے ہندوستان میں اور ۱۹۴۷ء کے ہندوستان میں کسی قسم کا کوئی فرق ہی نہیں ہوا۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا ایک سیاسی انقلاب پسند انسان تھے، انگریز دشمنی میں انتہا کو پہونچے ہوئے تھے۔ برطانیہ اور اس کی حکومت کو ایک آنکھ دیکھ نہیں سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس موضوع پر جب کبھی وہ بولتے ہیں تو قابو سے باہر ہو جاتے ہیں۔ ورنہ اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ملک کی عام فلاح و ترقی سے قطع نظر خاص مسلمانوں نے ستر اسی برس کے اندر انگریزوں کے زیر سایہ ہر شعبۂ زندگی میں جو ترقی کی ہے

---

[1] فیض الباری علی صحیح البخاری جلد ۳ ص ۴۴۹۔ [2] مکتوبات شیخ الاسلام حصہ اول مطبوعہ معارف پریس اعظم گڑھ ص ۱۸-۲۰
[3] مکتوبات شیخ الاسلام ج ۲ ص ۷۵ و ۷۶۔ [4] ایضاً۔

اور وہ بھی امن وامان کے ساتھ! مسلمانوں نے خود اپنے عہدِ حکومت کے گذشتہ دو سو برس میں نہیں کی تھی۔ چنانچہ راج گوپال اچاریہ کا بیان ہے کہ گاندھی جی نے ایک ظالم کی گولی کا نشانہ بننے سے دو برس پہلے ایک موقع پر فرمایا تھا کہ ہندوستان کے لوگ انگریزوں کے راج میں ننانوے فی صدی آزادی رکھتے اور اُس سے فائدہ اٹھاتے تھے۔[1]

بہرحال مولانا محمد انور شاہ اور مولانا حسین احمد دونوں ایک ہی مکتبۂ فکر کے بزرگ اور ایک ہی استاد کے نامور شاگرد تھے۔ لیکن اس کے باوجود ہندوستان کی شرعی حیثیت کے متعلق دونوں میں جو اس قدر شدید اختلاف پایا جاتا ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ مولانا مدنی پر سیاسی انقلاب پسندی اور انگریز دشمنی کا غلبہ اس قدر شدید تھا کہ اس معاملہ میں فقیہانہ سنجیدگی و متانت اور تاریخ کا واقعاتی شعور مغلوب ہو جاتے تھے۔ (باقی آیندہ)

---

[1] انگریزی روزنامہ اسٹیٹسمین مورخہ ۳۱ مئی ۱۹۶۶ء ص ۸ کالم ۳

معارفُ الآثار

از: لفٹننٹ کرنل خواجہ عبدالرشید صاحب

آرکیالوجی (اثریات) پر اہم کتاب۔ تاریخِ قدیم، دریائے سندھ اور بحیرۂ اسود کے دریاؤں کے علاقوں کی قدیم تاریخ، جغرافیا، آثارِ قدیمہ اور تہذیبوں کا تعارف، ایران اور عراق کی قدیم تہذیبوں کا وہاں کے آثار کی بنیاد پر مطالعہ۔ مصنف نے خود ان علاقوں کا دورہ کرکے اوریجنل نتائج حاصل کئے ہیں۔

صفحات ۱۷۰ قیمت ۳/- مجلد ۴/-

نیل سے فرات تک

از: ڈاکٹر محمد اقبال صاحب انصاری۔

مصنف کے اُن خطوط کا مجموعہ جو مصر، لبنان، شام، اردن، حجاز، عراق اور یروشلم سے لکھے گئے۔ عرب دنیا کی ہلچل، ان کی کامرانیاں اور مایوسیاں، ان کی معاشرت اور سوچ بچار وغیرہ ——— عرب دنیا میں، خاص کر مصر میں قیام کے دوران مصنف کا اُردو دنیا کو ایک دستاویزی تحفہ۔

صفحات ۱۸۴ قیمت مجلد ۳/-

پتہ: مکتبہ برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶